فکر و نظر............ اسلام آباد　　جلد: ۴۳　　شمارہ: ۴

سزائے قید کی شرعی حیثیت-قرآن و سُنّت کی روشنی میں

افتخار الحسن میاں*

کسی انسانی معاشرہ میں جب شدید نوعیت کے جرائم کی شرح خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے اور انسداد جرائم کے مروّجہ طریقے اور ذرائع بظاہر ناکام نظر آتے ہیں تو بعض اہل فکر و دانش بڑھتی ہوئی شرح جرائم کا حل شدید نوعیت کی سزاؤں میں تلاش کرتے ہیں۔ پاکستان کے مسلم معاشرہ میں بھی خطرناک جرائم کی شرح میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسلم مفکرین انسدادِ جرائم کے لیے کوڑوں کو اسلام کی اصل سزا قرار دیتے ہوئے سزائے قید کی شرعی حیثیت کا سوال اٹھاتے ہیں جو ان کے خیال میں ایک نرم سزا ہے۔ مجرم کی سزائے قید کا دائرہ اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے زیر کفالت افراد پر بھی اس کے شدید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بظاہر سزائے قید کے عمل سے گزرنے کے باوجود اکثر مجرم اخلاقی و معاشرتی طور پر بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔ ان عوامل کے باعث بھی سزائے قید کی شرعی حیثیت کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔

تاریخِ انسانیت کے مختلف ادوار میں جرائم کے انسداد اور مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا دینے کے لیے متنوع طریقے اختیار کیے گئے۔ جرم کیا ہے؟ اس حوالے سے مختلف انسانی معاشروں اور تہذیبوں کے اپنے معیارات رہے ہیں۔ انسانی معاشرے اپنی اجتماعی سوچ اور مزاج کے مطابق جرائم کے ارتکاب کی صورت میں مجرموں کے لیے سزاؤں کا تعیّن کرتے ہیں۔ اگرچہ اُمت مسلمہ اپنی اجتماعی فکر و دانش اور ضمیر کی روشنی میں بعض انسانی افعال کو جرم قرار دے کر سزا کا تعیّن کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے مگر بتقاضائے ایمان تمام مسائل کے حل میں قرآن و سنت سے رہنمائی لینے کے امتیازی وصف کو برقرار رکھتے ہوئے جرم و سزا کے تعین میں بھی اس کے افراد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی تعلیمات کا پابند سمجھتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کن افعال کے ارتکاب پر قرآن حکیم اور سنت نبوی میں سزائے قید کا حکم دیا گیا ہے اور مفسرین نے متعلقہ آیات و احادیث سے کیا استدلال

☆　ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DMHL

کیا ہے تا کہ سزائے قید کی شرعی حیثیت واضح ہو سکے۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات میں سزائے قید کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ. فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلاً.(۱)

ترجمہ: اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) اُن پر چار مرد اپنوں میں سے، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بند کر دو اُن عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کر دے اُن (کی زندگی) کو موت یا بنا دے اللہ تعالیٰ اُن (کی رہائی) کے لیے کوئی رستہ۔(۲)

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''زنا کو قابل سزا فعل ۳ھ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت یہ ایک ''قانونی'' جرم نہ تھا جس پر ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے بلکہ اس کی حیثیت ایک ''معاشرتی'' یا ''خاندانی'' جرم کی سی تھی جس پر اہل خاندان ہی کو بطور خود سزا دے لینے کا اختیار تھا''۔(۳)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زناکار عورتوں کی یہ سزائے قید مولانا مودودیؒ کے نزدیک شرعی حد نہ تھی اور ان کی رائے میں زنا اس وقت تک محض اخلاقی جرم تھا، از روئے قانون جرم ہی نہ تھا۔ جبکہ اس اقتباس کے پہلے جملہ کے الفاظ ''قابل سزا فعل'' اور ''قرار دے دیا گیا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کو ۳ہجری میں جرم قرار دے دیا گیا تھا اور اس کی ابتدائی سزا بھی بیان کر دی گئی تھی۔

اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں:

''اسلام نے اس فعل بد [زنا] کی روک تھام کے لیے صرف وعظ و نصیحت پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے سزا اور سزا بھی سنگین مقرر کی۔ لیکن ابتداء ہی میں سنگین سزا کا نفاذ نہیں فرمایا بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً۔ ان دو آیتوں [۴:۱۵، ۱۶] میں ابتدائی زمانہ میں جو سزا مقرر ہوئی اس کا ذکر ہے۔ سدی، قتادہ اور کئی دوسرے ائمۂ تفسیر کے نزدیک پہلی آیت شادی شدہ عورتوں کے متعلق ہے کہ اگر وہ اس جرم کا ارتکاب کریں تو انہیں اُن کے گھروں میں بطورِ سزا بحکم حاکم نظر بند کر دیا جائے۔ یہاں

تک کہ اُن کی زندگی ختم ہو جائے یا اللہ تعالیٰ اُن کے لیے کوئی دوسرا حکم نازل فرما دے۔ یہ آخری کلمات اس بات کا صاف پتہ دیتے ہیں کہ یہ عمر قید کی سزا عارضی سزا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری سزا تجویز ہونے والی ہے''۔(۴)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ زنا کو حرام قرار دیئے جانے کے بعد اس آیت میں اس کی ابتدائی سزا-سزائے قید مقرر کی گئی۔ 'بحکم حاکم' کی ترکیب واضح کر رہی ہے کہ زنا اب محض اخلاقی یا معاشرتی جرم نہ رہا تھا کہ جس کے ارتکاب پر سزا دے لینا اہل خاندان کا اختیار ہو بلکہ اس ابتدائی سزا کے لیے بھی ضروری تھا کہ تمام مقررہ شروط کے مطابق چار گواہ جرم کے وقوع کو ثابت کرنے کے لیے اس کی تمام ضروری جزئیات کے ساتھ حاکم کے رُو برو گواہی دیں۔ جرم بلا شک و شبہ ثابت ہو جائے تو حاکم کے حکم سے زنا کی مرتکب عورتوں کو اُن کے گھروں میں قید کیا جائے۔ آیت کے آخری کلمات کی طرف اشارہ کر کے فاضل مفسر نے 'عارضی سزا، اور 'کوئی دوسری سزا' سے ابتدائی حد اور مستقل حد کے معنیٰ مراد لیے ہیں۔

ممتاز مفسر علامہ قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں ابن العربیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے قبل زنا کی مرتکب عورتوں کو گھروں کے اندر عمر قید کی سزا دی جاتی تھی، مگر جب زنا کے مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور یہ اندیشہ ہوا کہ وہ معاشرہ میں قوت اختیار کر کے اس کے پرامن ماحول کو تہ و بالا کر دیں گے تو ان کے لیے باقاعدہ جیلیں بنا دی گئیں۔ عبارت ملاحظہ ہو:

وهذا الإمساك والحبس فی البیوت کان فی صدر الإسلام قبل أن یکثر الجناة، فلمّا کثروا و خشی قوتهم، اتّخذلهم سجن.(۵)

علامہ قرطبیؒ نے زنا کی پاداش میں عمر قید کاٹنے والی ان عورتوں پر عائد اس پابندی کی بناء پر کہ وہ اپنی موت یا نئی حد آنے تک کسی کے ساتھ نکاح بھی نہیں کر سکتیں، سزائے قید کو نہ صرف حد بلکہ اِسے دیگر حدود کی نسبت زیادہ شدید اور سخت سزا قرار دیا ہے۔(۶)

امام ابو بکر الجصاصؒ کہتے ہیں:

لم یختلف السلَف فی أن ذلک کان حد الزانیة فی بدء الإسلام و أنّه' منسوخ غیر ثابت الحکم...... و أما الحبس فکان موقوفاً علی ورود السبیل و قد بیّن النبی ﷺ ذلک السبیل وهو الجلد والرجم و نسخ جمیع ما ذکر فی الآیة إلاّ ما ذکر من

استشهاد أربعة شهود فإن اعتبار عدد الشهود باق في الحد.(۷)

ترجمہ: سلَف/ متقدمینؒ نے اس نکتہ پر کبھی اختلاف نہیں کیا کہ قید کی یہ سزا ابتدائے اسلام میں زنا کی مرتکب عورت کے لیے حد تھی۔ یہ سزا منسوخ ہو چکی ہے اور یہ حکم اب نافذالعمل نہیں رہا۔ کیوں کہ یہ عمر قید اُن عورتوں کے لیے کوئی راستہ/ سبیل نکلنے تک تھی۔ چنانچہ نبی مکرمﷺ نے وہ راستہ بیان فرما دیا کہ وہ حد [کنوارے زنا کاروں کے لیے] کوڑے اور [شادی شدہ زانیوں کے لیے] رجم ہے۔ اس آیت میں چار گواہوں سے گواہی کے مطالبہ کے سوا جو کچھ تھا، اسے حضرت محمد رسول اللہﷺ نے منسوخ فرما دیا۔ البتہ نئی حد میں بھی گواہوں کی اس تعداد کا اعتبار باقی ہے۔

علامہ سیّد محمود آلوسیؒ نے بھی اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اس عمر قید کو ابتدائی حد قرار دیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ زنا کی مرتکب ان عورتوں کے لیے ان کے گھروں کو جیل بنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے ابن جبیرؒ کا یہ قول بطور استشہاد درج کیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں اگر چار مسلمان عادل گواہ کسی عورت کے ارتکاب زنا کی شہادت دے دیتے تو اُسے [اُس کے گھر کی] جیل میں قید کر دیا جاتا تھا۔(۸)

امام فخرالدین رازیؒ نے بھی اس آیت میں مذکور عمر قید کو زنا کی مرتکب عورتوں کی حد قرار دیا ہے جو اصل اور مستقل حد کا حکم آنے تک تھی۔ جب وہ حکم آ گیا تو عمر قید کی یہ حد ختم کر دی گئی۔(۹)

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ کسی مفسر نے محض سزائے قید کو منسوخ قرار نہیں دیا بلکہ زنا کی مرتکب عورتوں کی عارضی حد جو کہ سزائے قید تھی، اُسے منسوخ قرار دیا ہے۔ اِس سے سزائے قید کی مشروعیت واضح ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سزائے قید کا جواز نمایاں انداز میں آشکار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”علاوہ ازیں **فامسکوهن فی البیوت** کے الفاظ سے تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز بھی نکلتا ہے“۔(۱۰)

سورۃ النسآء کی آیت ۱۵ کے جو مطالب و معانی ان افاضل مفسرین نے بیان کیے ہیں، اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی مرتکب عورتوں کو اُن کے گھروں میں آخری سانس تک قید میں رکھنے کا حکم، کسی نئے حکم کے نزول تک محض انتظار کی کیفیت نہ تھی بلکہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سزا اُن کے لیے بطور حد مقرر کی گئی تھی۔ اِس حد کو بعد میں منسوخ کر دیا گیا مگر سزائے قید کو اسلام

میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ چونکہ اس عمر قید کے دوران ان عورتوں کو نکاح کرنے کی ممانعت تھی۔ اِس وجہ سے اُن کی اِس سزا میں اور بھی شدّت آ گئی تھی۔ اِس لیے اِس آیت کے آخری حصہ میں اُن کے لیے کسی اور سزا کا وعدہ کیا گیا تھا تاکہ اِس شدید نوعیت کی نفسیاتی سزا سے انہیں رُستگاری مل سکے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قید کی سزا کوئی نرم سزا نہیں جیسا کہ بعض دانشوروں کا خیال ہے۔ یہ تو انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے۔

۲۲/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو انسانی حقوق کی ایک امریکی تنظیم Human Rights Watch نے U.S.Prisons and Offenders with Mental Illness یعنی 'امریکی جیلیں اور دماغی امراض میں مبتلا مجرم' کے عنوان سے اپنی رپورٹ میں سزائے قید کے انسان کی ذہنی صحت پر مرتب ہونے والے انتہائی مضر اثرات کی طرف دنیا کی توجہ دلاتے ہوئے لکھا:

> "One in six U.S prisoners is mentally ill. Many of them suffer from serious illness..... There are three times as many men and women with mental illness in U.S. prisons as in mental health hospitals. The rate of mental illness in the prison population is three times higher than in the general population. This 215 page report examines how prisons are dangerous and damaging places for mentally ill people".(11)
>
> ہر چھ امریکی قیدیوں میں سے ایک ذہنی مریض ہے۔ اُن میں سے بہت سے شدید نوعیت کے ذہنی امراض میں مبتلا ہیں...... امریکی جیلوں میں قید دماغی امراض کے شکار مردوں اور عورتوں کی تعداد امریکہ کے دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل مریضوں کی تعداد سے تین گنا زیادہ ہے۔ قیدیوں میں دماغی امراض کی شرح عام امریکی آبادی کی نسبت تین گنا زیادہ ہے۔ ۲۱۵ صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ جائزہ پیش کرتی ہے کہ جیلیں کس طرح خطرناک ہیں اور یہ ذہنی مریضوں کے لیے کتنی نقصان دہ جگہیں ہیں۔

عبدالقادر عودہ نے اگرچہ سزائے قید کو شریعت میں جائز قرار دیا ہے۔ تاہم جیلوں کے موجودہ نظام پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ”**وهو نظام كثير النفقة قليل الإنتاج يؤدى بالمسجونين إلى البله والجنون و يؤدى بعضهم إلى الانتحار.**(۱۲) یعنی یہ بہت زیادہ خرچ اور کم فوائد والا نظام ہے جو قیدیوں کو احمق اور پاگل بنا دیتا ہے اور اُن میں سے بعض کو خودکشی پر مجبور کر

دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزائے قید اپنے اثرات کی بناء پر کوڑوں سے نرم سزا قرار نہیں دی جا سکتی۔ خصوصاً کوڑے مارنے کے حوالہ سے مفسرین و فقہاء نے کوڑے کی جو تعریف بیان کی ہے کہ کوڑا کیسا ہونا چاہیے، کیسے مارا جائے اور کوڑے مارنے والا شخص کیسا ہو۔ اس میں مجرم کی صحت، عمر، جنس اور موسم کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ کوڑے مارنے سے متعلقہ جملہ امور پر غور کرنے کے بعد یہ کہنا خاصا دشوار ہے کہ کوڑوں کی سزا، سزائے قید سے شدید تر ہے۔ اس لیے خطرناک جرائم کے انسداد کے لیے یہ سزا زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے۔ جرائم کے اندراج، اُن کی تفتیش و تحقیق اور عدالتی نظام کے پورے ڈھانچہ میں اساسی تبدیلیوں کے بغیر محض سزاؤں سے انسدادِ جرائم کی توقع وابستہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

ہم مفسرین کے اقوال کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں زنا کی مرتکب عورتوں کو گھروں میں دی جانے والی عمر قید اُن کے لیے حد تھی۔ جبکہ مرد زناکاروں کی سزا زبانی ملامت، شرم و عار دلانا اور جوتوں سے پٹائی تھی۔(۱۳) سورۃ النساء کی آیت ۱۵ کے الفاظ ہی واضح کر رہے ہیں کہ عورتوں کو دی جانے والی سزائے قید عارضی حد ہے، اِس کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کی اِس شدید نوعیت کی سزا سے رستگاری کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ ابوبکر الجصاصؒ کہتے ہیں کہ اُمت میں اِس مسئلہ پر کبھی اختلاف نہیں رہا کہ یہ دونوں سزائیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کنوارے مرد و عورت زناکاروں کی نئی حد سورۃ النور کی آیت نمبر۲: ’’اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ......الخ‘‘۔(۱۴) ’’ترجمہ: زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو‘ میں بیان فرما دی جو پہلی سزاؤں کی ناسخ ہے۔ جبکہ زنا کے مرتکب شادی شدہ مرد و عورت کی نئی حد رجم (سنگساری) حدیث مبارک میں آئی ہے۔ حضرت عُبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

> **خُذُوْا عَنِّى، خُذُوْا عَنِّى، خُذُوْاعَنِّى، فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً، اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ، جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ.** (۱۵)
>
> ترجمہ: مجھ سے لو، مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ تعالیٰ نے زنا کی مرتکب عورتوں کے لیے رستگاری کا رستہ پیدا کر دیا ہے۔ غیر شادی شدہ مرد، غیر شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو ان کی حد سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد، شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو اُن کی حد سو کوڑے اور سنگساری ہے۔

حضور نبی رحمت ﷺ پر زنا کی مرتکب عورتوں کی گھروں میں قید تا موت کس قدر گراں تھی اور حضور ﷺ کس شدت سے انتظار فرما رہے تھے کہ کب اللہ تعالیٰ اس قید سے اُن کی رُستگاری کی صورت پیدا فرماتا ہے، وہ کیفیت انتظار اس حدیث مبارک کے ابتدائی کلمات کے تکرار سے ہی عیاں ہو جاتی ہے۔ اسلام میں کوڑے مارنے کے جن آداب کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، اُسے ذہن میں رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سو کوڑے اُن عورتوں کی آخری سانس تک قید سے بدرجہا نرم سزا ہے۔ خصوصاً اُس صورت میں انہیں شادی کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ کوڑوں کی سزا کے اِس حکم کے بعد وہ پابندی بھی ختم ہو گئی۔ اَب وہ اِس سزا کے عمل سے گزرنے کے بعد ایک پاکیزہ ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکتی تھیں۔

صحیح مسلم کی اِس حدیث میں ''نَفْیُ سَنَةٍ'' کے کلمات روایت ہوئے ہیں جبکہ صحیح بخاری میں ''تَغْرِیْبُ عَامٍ'' کے کلمات آئے ہیں۔ اِن ہم معنی کلمات کا یہ اختلاف دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔

مولانا مودودیؒ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''یہ حدیث اگرچہ سنداً صحیح ہے مگر روایاتِ صحیحہ کا ایک جمِ غفیر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر نہ عہد نبوی میں کبھی عمل ہوا، نہ عہد خلفائے راشدینؓ میں اور نہ فقہاء میں سے کسی نے ٹھیک اِس مضمون کے مطابق فتویٰ دیا''۔ (۱۶)

ابوبکر الجصاصؒ کہتے ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی حد میں اہل علم کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہے۔ اُن کے مطابق امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ، زُفرؒ اور امام محمدؒ کا موقف ہے کہ شادی شدہ زانی مرد اور عورت کو سنگسار کیا جائے گا، کوڑے نہیں مارے جائیں گے۔ جبکہ کنوارے مرد اور عورت کو ارتکابِ زنا کی پاداش میں سو کوڑے مارے جائیں گے، انہیں جلاوطن نہیں کیا جائے گا کیونکہ جلاوطنی حد نہیں ہے۔ یہ امام/قاضی کی صوابدید پر منحصر تعزیری سزا ہے۔

مجرم کے حالات اور ماحول کے پیش نظر اگر قاضی اُسے جلاوطن کرنے میں مصلحت سمجھے تو اُسے جلاوطن کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُسے یہ اختیار ہے کہ وہ مجرم کی توبہ اور اصلاح کا یقین ہونے تک اُسے قید میں رکھ سکتا ہے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ، امام مالکؒ، اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ بھی احناف کے ساتھ اِس نکتہ پر متفق ہیں کہ کوڑوں اور سنگساری کی دونوں سزائیں کسی ایک ہی مقدمہ میں مجرم کو نہیں دی جا سکتیں۔ لیکن وہ کنوارے زناکار مرد یا عورت کو کوڑوں کی سزا دینے کے بعد اسے جلاوطن کرنے کے قائل ہیں جبکہ احناف جلاوطنی کو کنوارے زناکاروں کی حد تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے

نزدیک یہ تعزیری سزا ہو سکتی ہے۔ امام مالکؒ کا موقف ہے کہ کنوارے زانی مرد کو تو سو کوڑوں کے بعد ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائے گا مگر کنواری زانیہ اور غلام کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ: ”وَمَنْ نُفِیَ حُبِسَ فِی الْمَوْضِعِ الَّذِیْ یُنْفَی اِلیہ“[۱۷] (اور جسے جلا وطن کیا جائے تو جس علاقہ میں اُسے جلاوطن کیا جائے، وہاں اُسے قید کر کے رکھا جائے)۔

سیّد محمود آلوسیؒ اور مولانا مودودیؒ نے بھی فقہاء کی مذکورہ آراء نقل کرنے کے بعد احنافؒ کی اس رائے کی تائید کی ہے کہ زنا کے مرتکب کنوارے مجرموں کی حد محض سو کوڑے ہے۔ جلاوطنی اُن کی حد میں شامل نہیں البتہ تعزیراً یہ سزا دی جا سکتی ہے۔[۱۸]

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں زنا کی مرتکب عورتوں کی حد گھروں میں قید تا موت تھی۔ بعد میں زنا کی حد کے طور پر اسے منسوخ کیا گیا۔ یعنی ایک حد کی جگہ دوسری حد متعارف و نافذ کر دی گئی، خود سزائے قید کو غیر اسلامی یا غیر شرعی سزا قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ حدیث عُبادہ بن صامتؓ کی جو وضاحت فقہاء نے بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عادی زناکاروں کے معاملہ کو دیگر مجرموں سے مختلف انداز میں دیکھا گیا ہے۔ اُن پر حد جاری کرنے کے بعد بھی اگر قاضی اُن کے حالات کی روشنی میں ضروری سمجھے تو وہ انہیں جلاوطن کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جلاوطنی کے اطلاق کا طریقہ امام مالکؒ کی رائے میں یہ ہے کہ مجرم کو اُس علاقہ میں قید کر کے رکھا جائے جہاں اُسے جلا وطن کیا جائے۔ اُسے قید کر کے رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ معاشرہ کو اس کے شر سے محفوظ رکھنے کی مصلحت عامہ یقینی بنائی جا سکے۔ اس سے سزائے قید کا جواز صاف ظاہر ہے۔

علاوہ ازیں سورہ المآئدہ کی آیت ۳۳ جسے آیت حرابہ بھی کہا جاتا ہے، میں اسلحہ کے زور پر اسلامی ریاست کے شہریوں کو لوٹنے والوں کے لیے چار سزائیں بیان ہوئی ہیں۔ آخری حصہ میں یہ سزا ارشاد ہوئی: ”اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ“[۱۹] یعنی یا جلاوطن کر دیئے جائیں / قید کر دیئے جائیں۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ”بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ اِن فقروں کے درمیان اَوْ (یا) کا کلمہ تخییر کے لئے ہے یعنی امام / قاضی کو اختیار ہے کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب سمجھے، دے...... لیکن جمہور علماء کا یہ خیال ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہوگی، جتنا جرم سنگین ہوگا، اتنی ہی سزا سخت ہوگی...... اور اگر انہوں نے نہ قتل کیا، نہ مال لُوٹا، صرف لوگوں کو دہشت زدہ اور ہراساں کیا تو پھر انہیں قید کیا جائے گا“۔[۲۰]

ابن جریر طبریؒ کے مطابق امام ابو حنیفہؒ اور دیگر احنافؒ نے آیت "اَوْیُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" سے سزائے قید مراد لی ہے۔ اُن کی اپنی رائے میں اس کا بہترین مفہوم یہ ہے کہ مجرموں کو کسی دور دراز شہر کی جیل میں قید رکھا جائے تاکہ جلاوطنی (اور قید) پر صحیح طور پر عمل ہو سکے۔[۲۱]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حبان بن شریحؒ کو لکھا کہ خطرناک چوروں کی گردنوں میں لوہے کے طوق ڈال کر انہیں (مدینہ منورہ اور شام کے درمیان ایک علاقہ) شَغَب میں جلاوطن کر دو یعنی وہاں کی جیل میں قید کر دو۔ گردنوں میں طوق ڈالنے کا مقصد عام لوگوں کو اُن کے خطرناک مجرم ہونے سے آگاہ کرنا تھا۔

حبانؒ اپنے خط میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پہلے ہی ان مخصوص چوروں کے خطرناک جرائم اور انہیں جیلوں میں قید رکھنے کی کیفیت سے آگاہ کر چکے تھے۔ مگر انہوں نے آیت حرابہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے آخری حصہ میں "اَوْیُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" کے الفاظ اپنے خط میں ترک کر دیئے تھے جس کا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نوٹس لیا۔ کیونکہ اِن الفاظ کے بغیر ان خطرناک مجرموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم مکمل طور پر واضح نہیں کیا جا سکتا۔[۲۲]

اس آیت کی تفسیر کے باب میں مفسرین اور فقہاء کے اقوال کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اپنے گورنر کے ساتھ اس مراسلت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مختلف جرائم کے ارتکاب پر ابتدائے اسلام سے مجرموں کو سزائے قید دی جاتی رہی ہے۔ جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد تک جیلوں کا باقاعدہ نظام وجود میں آ چکا تھا۔ اِسی لیے انہوں نے زیادہ خطرناک مجرموں کو کسی عام جیل میں رکھنے کے بجائے دور دراز علاقہ کی کسی زیادہ محفوظ جیل میں منتقل کرنے کی ہدایت جاری فرمائی۔

توحید و رسالت کے پروانوں پر کفار مکہ کے مظالم جب حد سے بڑھ گئے تو وہ اپنے گھر بار، کاروبار اور زمینیں سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ کر آباد ہوگئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اب اہل مکہ کی طرف سے ہر طرح کی ایذا رسانی سے محفوظ رہیں گے اور امن و بھائی چارے کی فضا میں عبادتِ الٰہی اور دعوتِ اسلام کے کام پوری دلجمعی کے ساتھ بلا خوف و خطر کر سکیں گے۔ مگر اہل مکہ نے یہاں بھی انہیں سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ کفار مکہ کے روز افزوں جارحانہ اقدامات کی وجہ سے اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مسلمان بھی اپنے دین اور قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے مجبوراً ہتھیار اُٹھائیں۔ چنانچہ سورہ حج کی آیت ۳۹ اور سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۰ میں جہاد کی اجازت مرحمت ہوئی۔ جبکہ سورہ محمد کی آیت نمبر۴ میں کفار سے متوقع جنگ کے حوالہ سے اہم ہدایات ارشاد فرما

دیں:

”فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَآ أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ...... الخ“[۲۳]

پھر جب (میدانِ جنگ میں) تمہارا کفار سے آمنا سامنا ہو تو اُن کی گردنیں اُڑا دو، یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر لو تو پھر کس کر باندھو رسیّاں۔[۲۴]

مقصد یہ ہے کہ جب تم مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کے خلاف جارحیت کے مرتکب کفار کے کشتوں کے پشتے لگا دو اور انہیں زخموں سے چور چور کر دو، یہاں تک کہ ان میں لڑنے کی سکت نہ رہے اور جنگ ختم ہو جائے تو باقی ماندہ کو قید کر لو اور اُن کی مُشکیں خوب کس کر باندھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھاگ جائیں اور تمہارے لیے پھر کسی خطرے کا باعث بنیں۔[۲۵]

اسلامی ریاست کی بقاء و سلامتی کے خلاف بیرونی جارحیت کے مرتکب کفار کا قلع قمع کرنے کے بعد زندہ بچ جانے والوں کو قید کر لینے کے اس قرآنی حکم سے یہ مفہوم اخذ کرنے میں بظاہر کوئی امر مانع نہیں کہ اسلامی ریاست افرادِ معاشرہ کو مجرموں کی طرف سے لاحق اندرونی خطرات کے انسداد کے لیے اُنہیں سزائے قید دے سکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں اسماعیل حقیؒ، جلال الدین سیوطیؒ، پیر محمد کرم شاہؒ اور مولانا مودودیؒ نے بیرونی جارحیت کے مرتکب ان مجرموں کو قید کرنے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ کہیں وہ پھر فوری طور پر منظّم ہو کر آپ کے لیے دوبارہ امن و سلامتی کے مسائل پیدا نہ کر دیں۔[۲۶] عام مجرموں کو دی جانے والی سزائے قید کا مقصد بھی مفسرین اور فقہاء نے یہی بیان کیا ہے کہ معاشرہ کو ان کے شر سے محفوظ کیا جا سکے۔ مقصد میں یکسانیت کی بناء پر اِس سے عام مجرموں کو دی جانے والی سزائے قید کا جواز بھی واضح ہوتا ہے۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصّہ کو قرآن حکیم نے احسن القصص فرمایا ہے کیونکہ اِس میں انسانیت کے لیے بہت سے اسباق ہیں۔ اِس سورہ کی آیات ۲۵، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۹، ۴۱، ۴۲ اور ۱۰۰ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قید، اس کے پس منظر اور ایّامِ جیل کے واقعات تفصیل سے آئے ہیں۔ اگرچہ اِن آیات میں کسی جرم کے ثابت ہونے پر دی جانے والی سزائے قید کے معنیٰ نہیں پائے جاتے بلکہ اس کے برعکس ایک بے گناہ اور پاک دامنی ہستی کو محض ریاستی جبر واستبداد کے تحت طویل عرصہ تک قید کیے جانے کے واضح دلائل بیان ہوئے ہیں۔ تاہم اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اسلام سے ہزاروں سال پہلے بھی سزائے قید دیئے جانے کا رواج تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام پر بہتان کی تفتیش سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر معاذاللہ جرم ثابت ہو جاتا تو انہیں سزائے قید پر اعتراض نہ ہوتا۔ اس کا اندازہ اُن کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور تم لوگ میری پاک دامنی کو تسلیم بھی کرتے ہو، پھر مجھے کس جرم میں سزائے قید دی گئی ہے۔ زلیخا اور اس کی ہم جولیوں نے بادشاہ کے سامنے دو ٹوک الفاظ میں اعتراف کیا کہ وہی ان کو اپنے دامِ ہوس میں پھانسنے کی کوشش کرتی رہیں جبکہ اِن میں کوئی برائی نہ تھی اور یہ بڑے سچے اور پاکباز ہیں۔ اُن کی بے گناہی اور بلند کردار اُن پر یوں عیّاں تھا جیسے دن نکل آیا ہوں، مگر اس کے باوجود انہیں طویل عرصہ تک جیل میں قید رکھا گیا۔ اُن پر اقدامِ زنا کا الزام بے بنیاد اور سراسر بہتان تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے بھی ۳ ہجری میں زنا کی مرتکب عورتوں کی ابتدائی حد اُن کی گھروں کے اندر سزائے قید تا موت مقرر کی۔ شاید ایسا اس لیے ہوا ہو کہ اُس وقت کے انسانی معاشرے سزائے قید کی تعزیری حیثیت سے خوب آشنا تھے، اِس لیے ابتداء میں زنا کی حد کے طور پر یہی سزا مقرر فرمائی گئی۔ بعد میں محض سزائے قید کو نہیں بلکہ زنا کی حد کے طور پر سزائے قید کو منسوخ کیا گیا تھا۔ تاہم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سبق آموز واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں کبھی جرم ثابت ہونے پر اور کبھی محض ریاستی جبر واستبداد اور سطوت و اختیار کے اظہار کے لیے سزائے قید کا اطلاق عام رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے سورۂ یوسف کی انہی آیات کے ضمن میں تاریخ کے مختلف ادوار کے علاوہ موجودہ دور میں ریاستی جبر و قہر کے اظہار کے لیے سزائے قید کے استعمال پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو شرائطِ انصاف کے مطابق عدالت میں مجرم ثابت کیے بغیر، بس یونہی پکڑ کر جیل بھیج دینا، بے ایمان حکمرانوں کی پُرانی سنت [طریقہ] ہے۔ اِس معاملہ میں آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ ''جمہوریت'' کا نام نہیں لیتے تھے، اور یہ اپنے اِن کرتوتوں کے ساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکتیں کیا کرتے تھے اور یہ ہر ناروا زیادتی کے لیے پہلے ایک ''قانون'' بنا لیتے ہیں۔ وہ صاف صاف اپنی اغراض کے لیے لوگوں پر دست درازی کرتے تھے اور یہ جس پر ہاتھ ڈالتے ہیں، اس کے متعلق دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُس سے اِن کو نہیں بلکہ

ملک و قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ صرف ظالم تھے۔ یہ اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں"۔ (۲۷)

سزائے قید سے متعلقہ قرآنی آیات اور کتب تفسیر سے اُن کی مزید وضاحت پیش کرنے کے بعد ہم اب سنتِ نبوی اور تعاملِ صحابہ رضوان اللہ علیہم کی روشنی میں سزائے قید کی شرعی حیثیت کا مطالعہ کریں گے۔

سزائے قید کی عہد نبوی سے اوّلین نظیر اسیرانِ بدر کی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ حالت امن میں بھی اُس عہد مسعود میں سنگین نوعیت کے جرائم کی تفتیش اور جرم ثابت ہونے پر بطور تعزیر سزائے قید کا اطلاق کیا جاتا رہا۔ بہز بن حکیم کی روایت ہے: "**أنّ رسولَ اللّٰہِ ﷺ حَبَسَ رجلاً في تُهمَةٍ**"(۲۸) کہ نبی مکرم ﷺ نے کسی جرم کی تہمت میں ایک شخص کو قید میں رکھا۔ اِسی مضمون کی کئی احادیث مختلف کتب حدیث میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً امام نسائی نے مذکورہ حدیث "رجلاً" کے بجائے "ناساً" کے لفظ کے ساتھ بیان کی ہے۔(۲۹) اس کے بعد انہوں نے بہز بن حکیم ہی سے یہ حدیث نقل کی ہے: "**أن رسول الله ﷺ حَبَسَ رجلاً في تهمة ثم خلّى سبيلَه**"۔(۳۰) کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کسی جرم کی تہمت کی بناء پر قید کیا، پھر عدم ثبوت کی بناء پر اُسے رہا فرما دیا۔

یہ دونوں احادیث امام نسائی نے "**باب امتحان السارق بالضرب والحبس**" یعنی چور کی تفتیش مار پیٹ اور قید کے ذریعہ سے، کے عنوان کے تحت درج کی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں جرم کی سزا کے علاوہ اُس کی تفتیش کے لیے بھی ملزم کو اس احتیاط کے پیش نظر قید کیا جاتا تھا کہ وہ عدالتی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے کہیں فرار نہ ہو جائے۔ جو سزا دوران تفتیش جرم کے وقوع کے محض قرائن کی بنیاد پر از راہِ احتیاط دی جا سکتی ہو، وہ جرم ثابت ہونے پر بطریق اولیٰ دینی جائز معلوم ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے حنفی اور حنبلی فقہاءؒ کہتے ہیں کہ پہلی چوری پر چور کا دایاں ہاتھ اور دوسری بار چوری کرنے پر اُس کی بائیں ٹانگ کاٹنے کے بعد تیسری بار چوری کرنے پر اُس کا مزید کوئی عضو نہیں کاٹا جائے گا۔ بلکہ وہ مسروقہ شئے کی قیمت ادا کرے گا، اُسے تعزیراً جسمانی سزا دی جائے گی اور اُسے اُس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ اُس نے چوری کرنے سے صدقِ دل سے توبہ کر لی ہے۔ اِن فقہائے کرام کی اِس رائے کی بنیاد حضرت علیؓ سے مروی یہ واقعہ ہے کہ آپ کے پاس ایک چور لایا گیا، جرم ثابت ہونے پر آپ نے اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ اُس نے پھر چوری کی، اِس بار اُس کی بائیں ٹانگ کاٹ دی گئی۔ تیسری بار وہ پھر

چوری کے جرم میں پکڑا گیا تو آپ نے فرمایا: اب میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔ اگر میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا تو یہ کیسے کھائے گا اور مسح کیسے کرے گا۔ اگر میں اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دوں تو یہ کیسے چلے گا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس کا مزید کوئی عضو کاٹوں۔ چنانچہ تیسری مرتبہ چوری کا جرم ثابت ہونے پر آپؓ نے چھڑی سے اُس کی پٹائی کی اور اُسے قید کر دیا۔[۳۱]

حضرت فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں ایک ایسے عادی چور کا واقعہ پیش آیا تھا جس پر دوبار حدِ سرقہ جاری کرنے کے بعد اس کے تیسری بار اسی جرم میں پکڑے جانے کے بعد جرم ثابت ہونے پر آپؓ نے اسے کوڑے لگوا کر قید کر دیا تھا۔[۳۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں نہ صرف سنگین جرائم کی تفتیش کی غرض سے ملزم کو قید کیا جاتا تھا بلکہ عادی مجرموں کو حدود کے مقدمات میں بطور تعزیر سزائے قید دینے کی روایات بھی ملتی ہیں۔

حضرت عمرؓ ہی کے دور میں معن بن زائدہ نے بیت المال کی سرکاری مہر کے نقش سے ملتی جلتی جعلی مہر بنوا کر مال کے اجراء کا حکمنامہ تیار کر کے بیت المال کے نگران کو دیا اور مال حاصل کر لیا۔ اس کی جعلسازی کا معلوم ہونے پر آپؓ نے اسے طلب فرمایا۔ جرم ثابت ہونے پر آپ نے اسے سو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا۔ کسی موقع پر اُس نے اپنی سزا پر اعتراض کیا تو آپؓ نے مزید ایک سو کوڑے لگوا دیئے۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے پھر اپنی سزا پر اعتراض کیا۔ اس بار پھر آپؓ نے اسے ایک سو کوڑے لگوائے اور جلا وطن کر دیا۔[۳۳]

قتل کے مقدمات میں بھی سزائے قید دیئے جانے کے احکامات اس کے جواز کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر یہ راہنما ارشاد فرمایا:

> إذَا أَمْسَکَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ وَقَتَلَهُ الآخَرُ يُقْتَلُ الَّذِیْ قَتَلَ وَيُحْبَسُ الَّذِیْ أَمْسَکَ.[۳۴]
>
> یعنی جب ایک شخص کسی کو پکڑ رکھے اور دوسرا اسے قتل کر دے تو قتل کرنے والے کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور مقتول کو پکڑ کر رکھنے والے کو قید کیا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک اور موقع پر اسی مضمون کا ارشاد فرمایا: "أُقْتُلُوا الْقَاتِلَ وَأَصْبِرُوا الصَّابِرَ"[۳۵] کہ قاتل کو قصاصاً قتل کر دو اور مقتول کو پکڑ رکھنے والے کو قید کر دو۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کے آخری دو کلمات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: أَحْبِسُوا الَّذِیْ أَمْسَکَ.[۳۶] کہ

جس نے مقتول کو پکڑ کر رکھا، اُسے قید کر دو۔

قتل کا ایک مقدمہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں اُن کے سامنے پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص نے مقتول کو پکڑے رکھا اور اس کے دوسرے ساتھی نے اُسے قتل کر دیا تھا۔ انہوں نے اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: **يُقْتَلُ الْقَاتِلُ وَيُحْبَسُ الآخَرُ فِي السِّجْنِ حَتَّى يَمُوْتَ.** (۳۷) کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور دوسرے کو جیل میں قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔

علامہ قرطبی کے حوالے سے ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے قبل مجرموں کو گھروں اور مسجدوں میں قید کیا جاتا تھا، مگر جب مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور یہ اندیشہ ہوا کہ وہ معاشرہ میں قوت اختیار کر کے اس کے پُرامن ماحول کو تہ و بالا کر دیں گے تو اُن کے لیے باقاعدہ جیلیں بنا دی گئیں۔

امام بخاریؒ (۱۹۴-۲۵۶ھ) نے "**صحیح البخاریؒ**" کی کتاب الخصومات کے "**باب الربط والحبس فی الحرم**" میں بتایا ہے کہ:

"**وَاشْتَرَى نَافِعُ بنُ عَبْدِ الْحَارِثِ دَاراً لِلسِّجْنِ بِمَكَّةَ مِنْ صَفْوَانَ بنِ أُمَيَّةَ عَلىٰ إِنْ عُمَرُ رَضِيَ فَالْبَيْعُ بَيْعُه، وَإِنْ لَمْ يَرْضَ عُمَرُ فَلِصَفْوانَ أَرْ بَعُمِائَةِ دِيْنَارٍ......الخ**"(۳۸)

حضرت عمرؓ کے حکم پر نافع بن عبدالحارث نے مکہ میں جیل بنانے کے لیے صفوان بن امیہ سے اس شرط پر ایک گھر خریدا کہ اگر حضرت عمرؓ اس سودے سے راضی ہوئے تو یہ بیع اُن کی شمار ہوگی۔ اور اگر وہ اِس سے راضی نہ ہوئے تو پھر یہ گھر میں چار ہزار دینار صفوان بن امیہ کو دے کر اپنے لیے خرید لوں گا۔

عبدالحی الکتانی نے "**التراتیب الاداریة**" میں اس خریداری کے حوالے سے قدرے وضاحت سے لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں رعیت شدید ہوگئی یعنی اس میں مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو آپ نے مکہ میں صفوان بن امیہ کو چار ہزار دینار ادا کر کے ایک گھر خریدا اور اسے جیل بنا دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سے جیلیں بنوانے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔(۳۹)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک اور پہلے تین خلفاء راشدینؒ کے دور میں حضرت علیؓ کے دور جیسی جیلیں نہ تھیں۔ اُن سے پہلے مجرموں اور ملزموں کو مسجد میں قید کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک گھر خرید کر اُسے باقاعدہ طور پر جیل قرار دے دیا۔ تاہم حضرت علیؓ تاریخ اسلام کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے مستقل جیل تعمیر کروائی اور اُس کا نام 'نافع' رکھا۔ مگر اس کی کوئی

چاردیواری نہ تھی، اِس لیے مجرم اِس سے بھاگ گئے۔ پھر آپ نے کوفہ میں چونے اور پتھر سے باقاعدہ پختہ جیل تعمیر کروائی۔ اس کے بعد اسلامی مملکت کے ہر اہم مقام پر جیلیں تعمیر ہونا شروع ہو گئیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ آج کل کی تنگ و تاریک جیلوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں جن میں گنجائش سے کہیں زیادہ تعداد میں قیدیوں کو ٹھونس دیا جاتا ہے کہ نہ وہ وضو کرسکیں اور نہ ہی نماز ادا کرسکیں اور ایک دوسرے کی شرمگاہ پر اُن کی نظر پڑتی رہے اور وہ شدید سردی اور گرمی کے موسموں میں اُس میں اذیت میں مبتلا رہیں۔[۴۰]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف سزائے قید اسلام میں جائز ہے بلکہ اس کے اطلاق اور مجرموں سے باقی معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک تدریجی عمل کے نتیجے میں باقاعدہ جیلیں تعمیر کر کے انہیں قید کرنے کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء اور مؤرخین اسلام قیدیوں کے انسانی حقوق پر بھی واشگاف انداز میں بات کرتے رہے ہیں۔

اس مقالہ کے آخر میں اس موضوع پر علامہ شوکانی کے حاصل تحقیق کا درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> **"والحاصل ان الحبس وقع فی زمن النبوة وفی أیّام الصحابة والتابعین فمن بعدهم إلَی الآن فی جمیع الأعصار والأمصار مِن دون إنکار".**[۴۱]
>
> اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ زمانۂ نبوت، عہد صحابہ و تابعین اور اُن کے بعد جو مسلم حکمران ہوئے ہیں، اُن سے لے کر اب تک [یعنی تیرہویں صدی ہجری تک] کے تمام ادوار اور تمام مسلم ممالک میں سزائے قید دی جاتی رہی ہے اور اس کے شرعی جواز کا کبھی کسی نے انکار نہیں کیا۔

حوالہ جات

۱۔ سورۃ النساء: ۱۵

۲۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری (۱۳۳۶-۱۴۱۸ھ/ ۱۹۱۸-۱۹۹۸ء) "ضیاء القرآن"، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۰۲ھ، ج۱، ص ۳۲۸

۳۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، (۱۳۲۱-۱۳۹۹ھ/ ۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) "تفہیم القرآن"، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، س ن ، ج۳، ص ۳۲۵

۴۔ مرجع سابق

۵۔ ابوعبداللہ محمد بن أحمد الانصاری القرطبی (م ۶۷۱ھ/ ۸۸۴م)، "الجامع لأحکام القرآن"، القاہرة، مطبعة دارالکتب

المصریۃ، ۱۹۳۷ء، ج۵، ص ۸۴

۶۔ ایضاً، ص ۸۵

۷۔ الإمام أبوبکر أحمد بن علی الرازی الجصاص (۳۰۵ھ-۳۷۰ھ/ ۹۱۷-۹۸۰م)، "أحکام القرآن"، (تحقیق: محمد الصادق قمحاوی)، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ب ت، ج۳، ص ۴۱ و ۴۵۔

۸۔ السیّد محمود الآلوسی (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴م)، "روح المعانی"، دمشق، إدارۃ الطباعۃ المنیریۃ، ب ت، ج۴، ص ۲۳۵

۹۔ الإمام فخر الدین الرزای، "التفسیر الکبیر"، مصر، المطبعۃ الخیریۃ، ۱۳۰۷ھ، ج۳، ص ۱۶۶-۱۶۷

۱۰۔ مولانا امین احسن اصلاحی (۱۳۲۲-۱۴۱۸ھ / ۱۹۰۴-۱۹۹۷م)، "تدبر قرآن"، لاہور، مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن، س ن، ج۲، ص ۳۸

۱۱۔ "U.S. Prisons and offenders with Mental Illness", at http://hrw.org/doc/?t=usa-pubc=usdom, Website visited on 06-06-2006.

۱۲۔ عبدالقادر عودہ (م۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴م)، "التشریع الجنائی الاسلامی"، القاہرۃ، دارالتراث، ب ت، ج۱، ص ۶۹۶

۱۳۔ "أحکام القرآن"، ج۳، ص ۴۱-۴۲

۱۴۔ سورہ النور: ۲

۱۵۔ الامام ابو الحسین مسلم بن الحجّاج بن مسلم (۲۰۶-۲۶۱ھ)، "صحیح مسلم"، الریاض، دارالسلام، ۱۹۹۹م، کتاب الحدود، حدیث نمبر ۴۴۱۴

۱۶۔ "تفہیم القرآن"، ج۳، ص ۳۱۹

۱۷۔ "أحکام القرآن"، ج۵، ص ۹۵

۱۸۔ "روح المعانی"، ج۱۸، ص ۸۲ و "تفہیم القرآن، ج۳، ص ۳۳۸، ۳۴۰

۱۹۔ سورۃ المائدہ: ۳۳

۲۰۔ "ضیاء القرآن"، ج۱، ص ۴۶۴-۴۶۵

۲۱۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ/۸۳۹-۹۲۳م)، "جامع البیان عن تأویل آي القرآن" (تحقیق: محمود شاکر)، بیروت، دار إحیاء التراث العربی، ب ت، ج۵، ص ۲۶۲

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ سورہ محمد: ۴

۲۴۔ "ضیاء القرآن"، ج۴، ص ۵۰۵

۲۵۔ ایضاً و "تفہیم القرآن"، ج۵، ص ۱۲

۲۶۔ ایضاً و جلال الدین عبدالرحمٰن بن أبی بکر السیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ / ۱۴۴۵-۱۵۰۵م) "الدر المنثور فی تفسیر المأثور"، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ط۱، ۲۰۰۰م، ج۶، ص ۲۰-۲۱، و إسماعیل حقی البروسوی (م ۱۱۳۷ھ)، "تفسیر روح البیان"، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۲۰۰۱م، ج۸، ص ۶۷۲

۲۷۔ تفہیم القرآن، ج۲، ص ۳۹۹-۴۰۰

۲۸۔ الإمام الحسین بن مسعود البغوی (۴۳۶-۵۱۶ھ)، "شرح السنۃ"، القاہرۃ، المکتب الاسلامی، ب ت، ج۸، ص ۱۹۵ و "سنن أبی داوٗد"، حدیث نمبر ۳۶۳۰ و حدیث نمبر ۳۰۳۶

۲۹۔ الإمام أبو عبدالرحمٰن أحمد بن شعیب بن علی النسائی (۲۱۵-۳۰۳ھ)، ''سنن النسائی'' [فی] الکتب الستۃ، الریاض، دارالسلام، ۱۹۹۹ء، حدیث نمبر ۴۸۷۹۔

۳۰۔ ایضاً، حدیث نمبر ۴۸۸۰

۳۱۔ الدکتور وھبۃ الزحیلی، ''الفقہ الاسلامی و أدلتہ''، دمشق، دارالفکر، ط ۳، ۱۹۸۹ء، ج۶، ص ۵۹

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ أبو محمد عبداللہ بن أحمد بن محمد بن قدامہ (م۶۲۰ھ)، ''المغنی''، الریاض، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ج۸، ص ۳۲۵

۳۴۔ الإمام محمد بن علی بن محمد الشوکانیؒ (م ۲۵۵ھ)، ''نیل الأوطار'' (محققۃ)، بیروت، دارالکتب العربیۃ، ۱۹۹۹ء، ج۷، ص ۲۵

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ الإمام أبو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ/۸۱۰-۸۷۰ھ)، ''صحیح البخاری''، الریاض، دارالسلام للنشر والتوزیع، ۱۹۹۹ء، کتاب الخصومات، باب الربط والحبس فی الحرم، حدیث نمبر ۲۴۲۲

۳۹۔ الحافظ عبدالحی الکتانی، ''التراتیب الإداریۃ''، الرباط، المطبعۃ الأھلیۃ، ۱۳۴۶ھ، ج۱، ص ۲۹۸

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۹۵-۲۹۶

۴۱۔ ''نیل الأوطار''، ج۸، ص ۳۴۳-۳۴۴

تعارف و تبصرۂ کتب

نام کتاب : نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ناشر : مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار، لاہور

سالِ اشاعت : جون ۲۰۰۵ء

صفحات : ۴۵۷

قیمت : ۲۲۵ روپے

تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد طاہر منصوری*

آقائے دوجہاں حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ و مطہرہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ قرآنی ارشاد "**ورفعنا لک ذکرک**" کی لازوال صداقت کا یہ مظہر ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال سے دنیا کے گوشے گوشے میں خدا کے نام کے ساتھ جناب رسالت مآب ﷺ کا نام مبارک بلند ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات اور تعلیمات پر روز روز نئی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں اہل علم و محقق آپ کی سیرت مطہرہ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

فلک کی رفعتیں روشن مہ تمام کے ساتھ
بلند نام محمدؐ خدا کے نام کے ساتھ

نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے کئی پہلو اور گوشے ہیں۔ ان میں سے ہر گوشہ مسلمان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک قابل اطاعت نمونہ ہے۔ "**لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ**"۔

نبی اکرم ﷺ نے جہاں زندگی کے اور بہت سے شعبوں کے لیے تعلیمات دی ہیں وہاں تعلیم و تربیت کے میدان میں بھی آپ نے خصوصی طور پر اُمت کی راہنمائی فرمائی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے معلم کے طور پر مبعوث فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إنّ اللّٰہ لم یبعثنی مُعَنِّتاً ولا مُتَعَنِّتاً ولکن بعثنی مُعَلّما میسّرًا.

بے شک مجھے اللہ نے لوگوں کو جھڑکنے والا بنا کر مبعوث نہیں کیا بلکہ مجھے آسانی کرنے

☆ ڈائریکٹر مطبوعات، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد

والا معلم بنا کر بھیجا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم'' میں ملک کے معروف محقق و دانشور اور اسلامی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے آپ ﷺ کی شخصیت و سیرت کے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مسلمان معلم و مدرس کو اپنی تدریسی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے کن امور کا لحاظ رکھنا چاہیے؟ اسے کن صفات سے بہرہ مند ہونا چاہیے؟ اپنی بات کو مؤثر طریقے سے مخاطب تک پہنچانے کے لیے کون سے اسالیب ہو سکتے ہیں؟ استاذ اور شاگرد کا باہمی تعلق کس طرح کا ہونا چاہیے؟ اس کتاب میں اس طرح کے تمام سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ مصنف نے فن تدریس، وسائل تعلیم، معلم کی شخصیت، استاد و شاگرد کا تعلق غرضیکہ تعلیم و تدریس سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ معلم کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کے مطالعے کے لیے مصنف نے چھیالیس موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو تعلیم و تدریس کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان موضوعات پر انہوں نے سیرت طیبہ کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ احادیث کی تخریج اور ان کی استنادی حیثیت پر گفتگو بہت عالمانہ اور محققانہ انداز میں کی ہے۔ کتاب میں احادیث شریفہ کو ان کے اصل مآخذ و مراجع سے نقل کیا گیا ہے۔ آیاتِ شریفہ اور احادیث مبارکہ سے استدلال کرتے وقت کتب تفسیر اور شروح حدیث سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مستند علمی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک مسلمان معلم کے لیے یہ کتاب غیر معمولی افادیت کی حامل ہے۔ معلم کے فرائض، اس کی شخصیت و کردار، طریقہ تدریس، وسائل تربیت کے حوالے سے اس کتاب میں ہمیں کئی راہنما اصول ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ استاد کا اپنے شاگرد کے ساتھ انتہائی قریبی اور گہرا تعلق ہونا چاہیے۔ ان کے درمیان محض سطحی نوعیت کا تعلق نہ ہو بلکہ محبت و احترام اور خیرخواہی پر مبنی تعلق قائم ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں فاضل مصنف نے سیرتِ طیبہ سے کئی شواہد پیش کیے ہیں کہ جناب رسالت مآب ﷺ اپنے صحابہ طلباء کے لیے انتہائی محبت کے جذبات رکھتے تھے۔ آپؐ طلبہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے اور ان کا خیر مقدم کرتے۔ آپؐ طالب علم کو اس کے نام اور کنیت سے پکارتے جس سے اسے اپنائیت کا احساس ہوتا۔

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ طالب علم کے ساتھ ذاتی نوعیت کا تعلق، اس کے ساتھ

خیر خواہی، اور اسے اس کے نام سے پکارنا جیسے امور تدریسی عمل میں کس قدر مؤثر ہوتے ہیں۔

گفتگو میں ٹھہراؤ بات کو مخاطب تک مؤثر طریقے سے پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ٹھہر ٹھہر کر اپنا مدعا بیان کرتے، آپؐ عجلت سے کام نہ لیتے، بعض اوقات بات کو دو اور تین دفعہ دوہراتے تاکہ طالب علم کے ذہن میں بات اچھی طرح جاگزیں ہو جائے۔ تشبیہات اور تمثیلات بات کو مؤثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان سے بات میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور مخاطب کو بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ آپ ﷺ مدعا کی وضاحت میں تشبیہات و تمثیلات کا بھی سہارا لیتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اچھے دوست و ہم نشین کو مشک والے اور برے ساتھی کو بھٹی دھونکنے والے سے تشبیہ دے کر نیک اور صالح لوگوں کی صحبت و ہم نشینی کی ترغیب دی ہے۔ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ مشک و کستوری والے کا ہم نشین خوشبو سے مستفید ہوتا ہے اور بھٹی دھونکنے والے کے ساتھ بیٹھنے والے کو آگ کی تمازت اور دھوئیں کی بو کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

نبی اکرم ﷺ اپنی بات کو سمجھانے کی خاطر بسا اوقات اشاروں، اشکال اور لکیروں سے بھی مدد لیتے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا پھر فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی راہ ہے''۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی دائیں جانب اور بائیں جانب خطوط کھینچے۔ پھر فرمایا: یہ جدا جدا راہیں ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: اور بلاشبہ یہ میری راہ ہے سیدھی، سو تم اس پر چلو اور دوسروں کی راہوں پر مت چلو، وہ تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس طرح نبی اکرم ﷺ نے خطوط سے راہِ الٰہی اور شیطانی راہوں کے فرق کو واضح فرمایا۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے لمبی اُمیدوں اور انسان کے مسلسل مصائب کی کیفیت کو ایک شکل کے ذریعے واضح کیا۔

اپنے مقصود و مدعا کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک مؤثر طریقہ دو اشیاء کے درمیان تقابل و موازنہ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ زیر بحث امر کا کسی دوسری چیز کے ساتھ تقابل کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ اس اسلوب کو بھی کثرت سے استعمال کرتے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے دنیا کی فانی لذتوں کا آخرت کے عیش و آرام اور اس کی نعمتوں سے موازنہ فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے پھر دیکھے کہ پانی کا کتنا حصہ اس کے ساتھ لگتا ہے؟''۔

طلبہ کی توجہ مبذول کرنے اور اس کے شوق کو انگیخت کرنے کا ایک طریقہ اجمال سے تفصیل کی طرف جاتا ہے۔ آپ ﷺ اپنی بات پہلے اجمالی طور پر پیش کرتے، پھر اس کی تفصیل بیان فرماتے۔ تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ افراد اس اسلوب کی اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں۔ ایک اچھا اور ماہر استاد اپنا لیکچر پہلے اختصار کے ساتھ نکات کی صورت میں پیش کرتا ہے، پھر ان نکات کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔

کتاب میں تعلیم و تربیت سے متعلق اور بھی کئی راہنما اصول دیئے گئے ہیں۔ یہ اصول ایک مسلمان مدرس و معلم کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ یہ کتاب بلاشبہ اسلامی فن تعلیم و تربیت پر ایک اہم علمی ماخذ و مراجع ہے۔ تاہم کتاب میں چند امور قابل لحاظ و توجہ ہیں:

۱۔ مصنف نے کچھ منتخب عنوانات کے تحت احادیث کے ترجمے اور محدثین کے توضیحی ملاحظات کے ساتھ نقل کر دی ہیں۔ اگر وہ موجودہ طریقہ تالیف کے مطابق مختلف ابواب کے تحت موضوعات پر اپنے انداز میں گفتگو کرتے اور نصوص کو بطور شواہد لاتے تو کتاب کی علمی وقعت میں زیادہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ موجودہ شکل میں یہ کاوش ایک طبع زاد تصنیف کی بجائے تالیف نظر آتی ہے جس میں صاحب کتاب کی اپنی شخصیت گم ہو کر رہ گئی ہے۔

۲۔ زبان میں مشکل پسندی ہے۔ عربیت کا رنگ غالب ہے۔ سلاست و بے ساختگی مفقود ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب بنیادی طور پر عربی میں لکھی گئی ہے اور بعد میں اسے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں عنوانات کی بھرمار ہے۔ ہر حدیث کو ایک مستقل عنوان دیا گیا ہے۔ جبکہ اپنے موضوع اور علمی مواد کے اعتبار سے یہ سب احادیث کسی ایک مرکزی موضوع کے تحت آتی ہیں۔ مثال کے طور پر موضوع نمبر۹ بعنوان ''شاگردوں کو نام، کنیت یا لقب سے پکارنا'' (ص ۱۱۸) کے تحت فاضل مصنف نے کئی ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں جو کہ اپنی نوعیت و ماہیت میں کم و بیش ایک ہی جیسے ہیں۔ مثلاً

۱۔ مخاطب کو ایک دفعہ پکارنا

۲۔ مخاطب کو دو دفعہ پکارنا

۳۔ مخاطب کو تین دفعہ پکارنا

پھر ان میں سے ہر ایک کو مزید ذیلی عنوانات دیئے ہیں، یہ عنوانات بھی ایک ہی طرح کے ہیں، جیسے:

۱۔ عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو ندا
۲۔ ابوذرؓ کو ندا
۳۔ عائشہؓ کو ندا
۴۔ عباسؓ کو ندا
۵۔ ابی ابن کعبؓ کو ندا
۶۔ معاذ بن جبلؓ کو ندا

ہماری رائے میں ہر حدیث کو مستقل عنوان دینے کی ضرورت نہیں۔ خاص طور پر جبکہ عنوانات ایک دوسرے سے مختلف بھی نہ ہوں۔ فاضل مصنف کو چاہیے تھا کہ وہ ''شاگردوں کو نام، کنیت اور لقب سے پکارنا'' کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے اور تعلیمی نقطہ نظر سے واضح کرتے کہ اس عمل کی تعلیمی نفسیات میں کتنی اہمیت ہے، پھر گفتگو کے ضمن میں احادیث کو شواہد کے طور پر پیش کرتے۔ عنوانات کی کثرت سے گفتگو کی سلاست و روانی متأثر ہوتی ہے۔

۴۔ بعض عنوانات کی ساخت محل نظر ہے۔ مثال کے طور پر کتاب کی ایک مبحث کا عنوان ہے: ''شاگردوں کے بعض اعضائے جسم کو چھونا'' (ص۱۳۱)۔ ایک اور مبحث کا عنوان ہے: ''اظہار تعلق کے لیے ضرب لگانا'' (ص۱۳۹)۔ ایک مبحث کا ذیلی عنوان ہے: ''عورت کی دبر میں جماع کی ممانعت'' (ص ۲۴۰)۔ تعلیمی و تربیتی پہلو سے ان عنوانات کی افادیت کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ اگر بے ادبی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عنوانات کا یہ انداز کچھ زیادہ باوقار نہیں ہے۔

ان ملاحظات کے باوجود کتاب کی علمی افادیت میں کوئی کلام نہیں۔ تعلیم و تربیت سے متعلق اس میں بہت مفید معلومات ہیں۔ یہ شاید اپنی نوعیت کی پہلی علمی کاوش ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے تعلیمی و تربیتی پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اسلامی یونیورسٹی کے کلیہ تعلیم و تربیت کو اس کتاب کے مشمولات اور موضوعات کو سامنے رکھ کر باقاعدہ اس طرح کا مضمون متعارف کرانا چاہیے جس میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا بطور معلم مطالعہ کیا جائے۔